

عصمت چغتائی

(۱۹۱۵ء - ۱۹۹۱ء)

عصمت کی پیدائش بدایوں کی ہے اور پرورش آگرہ (اکبر آباد) کی ہے۔ جب کہ ان کا آبائی وطن بھوپال ہے۔ عصمت چغتائی کو بچپن میں اپنے بڑے بھائی عظیم بیگ چغتائی کی صحبت و تربیت ملی۔ چنانچہ ان کی صحبت اور گھر میں مطالعے کی روایت نے انھیں اردو ادب کی طرف مائل کیا اور ان کے قلم سے جدید اردو افسانے کو ایک نئی سمت ملی۔

عصمت چغتائی کردار نگاری، جذبات نگاری، نفسیاتی کیفیات کے اتار چڑھاؤ کی غمازی، زبان و بیان کی بے باکی و سرعت کے اعتبار سے معاصرین میں نمایاں ترین حیثیت رکھتی ہیں مگر ان کی تحریروں کا ایک بہت بڑا نقص حد سے زیادہ بے باکی ہے جو تہذیب و شائستگی کی تمام حدود پار کر لیتی ہے۔ حقیقت نگاری اور عریاں نگاری میں بہت فرق ہے مگر عصمت اپنے عہد کی جذباتی تحریکوں کے زیر اثر رد عمل کے جذبات سے مغلوب ہو کر اس فرق کو ملحوظ نہ رکھ سکیں، جس کے باعث ان کی تحریریں نہایت عمدہ ہونے کے باوجود اخلاقی معیار سے فروتر رہیں اور فحش نگاری کے زمرے میں داخل ہو گئیں اور ان کی تحریروں کا ابلاغ تعلیم و تدریس و تربیت کے بجائے لذت تک محدود ہو گیا۔ اس عہد کے اکثر افسانہ نگاروں کا یہی المیہ ہے، صرف پریم چند ان عیوب سے محفوظ رہے۔

عصمت کا مشاہدہ قریبی اور ذاتی ہے، ان کی تحریر میں تمام تہذیبی، معاشرتی اور خاندانی تصویریں جیتی جاگتی، بولتی چالتی محسوس ہوتی ہیں۔ منظر کشی وہ اس چابک دستی سے کرتی ہیں کہ تمام جز وکل سامنے آ جاتے ہیں، اپنے معاشرے کے بچے اُدھڑنے میں عصمت کو مہارت حاصل ہے۔ ان کی تحریر میں چھوٹے چھوٹے فقرے اور جملے، با محاورہ روزمرہ میں اس طرح ادا ہوتے ہیں کہ قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

ان کی اہم تصانیف ”چوٹیں“، ”کلیاں“، ”ایک بات“، ”چھوٹی موٹی“، ”دو ہاتھ“، ”دوزخی“، ”شیطان“، ”دھانی بانگپن“، ”ہم لوگ“، ”قیدی“، ”میزھی لکیر“، ”معصومہ“، ”سوداگی“، ”جنگلی کبوتر“ ہیں۔

جانی دشمن

عصمت چغتائی

عالیہ نے حیرت سے پرچے کو دوبارہ پڑھا۔ خالہ جان نے اسے بلایا تھا۔ وہ اس کی خالہ جان خاک بھی نہ تھی۔ وہ اپنی سہیلیوں کی ماؤں، نانیوں سے ایسے ہی خالہ، چچی، پھوپھی کا رشتہ لگایا کرتی تھی۔ اس نے کچھ عادت ہی رشتہ جوڑ قسم کی پائی تھی۔ کالج میں قدم رکھتے ہی جو بہنا پے کرنا شروع کیے تو معلوم ہوا اپنی کلاس کی لڑکیاں تو خیر تھیں ہیں گھٹنا پھوڑے کی، ہر کلاس میں دوستی اور رشتے کا بیج بوڈالا۔ اور تو اور استادوں سے بھی باوا آدم کے رشتے سے میل جول بڑھالیا۔ پھل لیے چلی آرہی ہیں۔ ساڑھیاں کڑھوائے دیتی ہیں۔ سویٹر بن رہی ہیں اور دعوتوں کا تو کوئی ٹھکانا نہیں۔ آج نیاز ہے، تو کل کسی بھائی بھتیجے کا مونڈن یا سالگرہ، کبھی دور دراز کے رشتہ داروں کی شادی کے رقعے بانٹتی پھر رہی ہیں، تو ساتھ ساتھ دلہن دو لہا دونوں کی طرف سے شرکت کے لیے اصرار کیے جاتی ہیں۔

جوجل کر انھیں چڑاتا وہ انتقاماً اسی کے گلے پڑ جاتیں اور اتنی شدید دوستی کر کے چھوڑتیں کہ تو بہ۔ کسی کو جھوٹی حاضری لگوانی ہو آپ سینہ سپر، کسی کو اپنے یار غار سے ملنا ہے آپ ادھر ادھر کے ناطے جوڑ جاڑ اپنے گھر میں دونوں کو بلانے پر بضد، کہیں چندہ جمع ہو رہا ہے، عالیہ بیٹیا سب سے آگے۔

”ارے بھئی تم ٹھہریں سنی جماعت، شیعہ لڑکیوں کی مجلس سے واسطہ؟“

”ارے اللہ قسم بڑا مزہ آئے گا۔ مسرور فاطمہ کیا نوے پڑھتی ہے کہ کلیجہ ہل ہل جاتا ہے۔“

”تو اب ہولی اور دیوالی بھی مناؤ گی؟“ ”لوگ پوچھتے۔“

”کیوں نہیں جی۔ ہمیں دیے اچھے لگتے ہیں اور ہولی میں اللہ قسم پچھلے سال نصیر بھیا نے

ڈامرل دی تھی، اُف! میری تو ساری چوٹی چپک کر جو نا ہو گئی تھی۔ کئی گھنٹوں مٹی کے تیل سے اور نہ

جانے کس کس سے گھسائی کی، مگر ہفتہ بھر تک بھتیوں کی شکل سے پھری، ساری چوٹی غارت ہو گئی۔“

وہ ایسے چٹخارے لے کر بیان کرتیں جیسے بھتیوں کی سی شکل لیے پھرنا اور چوٹی غارت کروا بیٹھنا ہی

اور کمرس کے موقع پر عالیہ بٹیا سارے بورڈنگ کو سر پر اٹھا لیتیں۔ دنیا بھر کا سامان سارے محلے سے مانگ کر جوڑتیں اپنے ساتھ دوسروں کو بھی بوکھلا لیتیں۔ پریزنٹ بن رہے ہیں، ہال سجایا جا رہا ہے۔ نشاط ہوٹل سے لے کر میٹری بھون تک گھوڑے کی چال دوڑے چلی جا رہی ہیں، کپڑوں کی پوٹلیاں لیے بکٹ بھاگ رہی ہیں۔

”اے بھئی، بے بی کرائسٹ کے لیے پنگورا کتنا سڑا ہوا ہے۔ اللہ کوئی پی منگوادو۔ ذرا اپنے تیکے سے سانٹا کلاز کی ڈاڑھی کے لیے روئی دے دو۔“

جس کا جی چاہے عالیہ بٹیا کو بے وقوف بنا کر الو سیدھا کر لے، جس کا جی چاہے پھسلا کر جو چیز چاہے مانگ لے۔ امتحان کے زمانے میں ساری کتابیں نوٹس اور پیپر دوسرے مانگ لے جاتے، یہ لائبریری میں کتابوں سے سر مار رہی ہیں۔ ایک دفعہ تو کسی کو سوال حل کر کے دیتی ہوئی پکڑی گئیں۔ اگر دوسری کوئی ہوتی تو اسی وقت امتحان کے ہال سے نکال باہر کی جاتی۔ عالیہ بٹیا نے اپنی صاف نھری ہوئی حیرت زدہ آنکھوں سے کچھ ایسے دیکھا کہ نگرانی کرنے والی ٹیچر مسکرا کر مر گئی۔ عالیہ بٹیا تو باؤلی تھیں اور اس باؤلے پن کی جتنی سزا انھیں ملتی کم تھی، اپنی فیس لائیں مگر کوئی لڑکی بسورتی کہ منی آرڈر نہیں آیا بڑی مصیبت ہے، یہ جھٹ اس کی فیس دے دیتیں۔ پتہ نہیں انھیں تنبیہ کی جاتی تھی کہ نہیں، کبھی پرنسپل کے دفتر سے منھ لٹکائے تو نکلتی دیکھی نہیں گئیں اور یہ نہیں کہ عالیہ بٹیا کوئی رئیس لکھ پتی کی بیٹی تھیں، یتیم تھیں اور ماموں کے گھر رہتی تھیں۔ وظیفوں سے تعلیم گھٹ رہی تھیں۔ مگر دل تھا کہ معاذ اللہ۔ جیسے گنگا جمنہ کا سنگم۔ کم بخت کی حماقتوں پر پیار آتا تھا۔

”رضو بٹیا نے پھر کوئی سو رپن کیا جو خالہ جان نے بلا بھیجا“ عالیہ بٹیا پریشان ہو کر سوچنے لگیں۔

رضیہ اتنی ہی بد ذات تھیں جتنی یہ بھولی تھیں۔ نہایت خود غرض، بے حد اکلوتی اور لاڈلی، اماں ابا کی زندگی کا سہارا، دادا، دادی کی آنکھوں کی ٹھنڈک، تنہیال کی لاڈوں بگاڑی۔ دولت کے

نشے میں غرق۔ اور لڑکیاں تو ان سے سیدھی طرح بات کرنا بھی اپنی ہتک سمجھتی تھیں۔ مگر عالیہ بیٹیا تو ان پر بھی حسبِ عادت ٹوٹ پڑیں۔ لوگوں نے بہت سمجھایا بجھایا، خوشامدی اور چا پلوس کہا۔ خود رضیہ نے یہی سمجھا کہ وہ ان کی موٹر میں لفٹ لینے کے لیے مکھن چپڑ رہی ہیں۔ مگر وہ بھلا ماننے والی تھیں۔ کلیجہ نکال کر تھما دیا اور بالکل بے غرض۔ مجال ہے جو موٹر میں لفٹ لے جائیں۔ وہی اپنے رکشے میں کچھ کھچھڑ کرتی آتی جاتیں۔

”نہیں بھٹو، کلو اغریب کیا کہے گا۔“ کلو آپ کا چہیتا رکشے والا تھا جس کے ہر سال وہ راکھی باندھ کر ایک روپیہ نیگ پا کر، جامے سے باہر ہو جایا کرتی تھیں۔ کلو ا کچھ اور پیاروں سے کم لاڈلا نہیں تھا۔ ہاں فیضو درزی کی اور بات تھی سارے بورڈنگ سے سلائی مانگ مانگ کر اسے دلواتی تھیں۔ اس کی ایسی پلٹی کرتی تھیں کہ سب سمجھتے تھے اس پر لٹو ہیں۔ بوڑھا ہے تو کیا ہوا یہ بھی سڑن ہیں۔

مگر وہ لٹوکس پر نہیں تھیں؟ ان کی بوکھلاہٹوں پر غصہ آتا تھا، مگر انھیں اس غصے پر پیارا آتا تھا۔ لاشتم پشتم خالہ جان کے ہاں پہنچیں۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ رضو بیٹیا کی ناک لال پکوڑا ہو رہی تھی۔ خالہ جان ٹھنڈی سانسیں بھر رہی تھیں۔

”علو تمہرا کہا تو بہت مانت ہے رضو، تمہیں اُوکا سمجھاؤ“ خالہ جان نے منہ بسور کر کہا۔ عالیہ بیٹیا ہل گئیں۔

”اونادروا کے پیچھے ہلکان ہوئے رہی ہیں۔ ہم کہہ دیا ہے کہ بیٹیا ہماری لاس پہ سے برات جیسے۔ ہم تم کا بھنگی کا دے دیہیں بھلا۔“

”اے ہے خالہ جان۔ نادر میں ایسی کون سی برائی ہے؟“ زندگی میں پہلی بار انھوں نے کسی کی عرض داشت میں عیب نکالا ورنہ عادتاً انھیں خالہ جان اور نادر دونوں کی حمایت میں چکر گھٹی ہو جانا چاہیے تھا۔ ان کا کلیجا تو ہر کسی کے لیے پھٹنے لگتا تھا۔

”اے بیٹیا، اُونکما ڈوئی کوڑی کا جُلا ہا، اُوکی اتنی ہمت کہ ہماری بیٹیا کا بہکائے کے جائدا پے دانت نکوسے۔“

یہاں عالیہ بٹیا قائل ہو گئیں۔ واقعی رضو بٹیا کی جائیداد پر دانت نگوسنے کا نادر میاں کو کوئی حق نہیں پہنچتا۔ مگر اب کیا کیا جائے؟ رضو بٹیا ایک دم دل کے ہاتھوں بے بس ہو چکی ہیں۔ دن کا چین اور راتوں کی نیند اڑی ہوئی ہے۔ نادر کے لیے جان دینے کو تیار ہیں۔

”اے ہے بھئی، اللہ نہ کرے“ عالیہ نے انھیں کلیجے سے لگا کر کہا۔

”نہیں سچ علو، اب ان کے بغیر ہم زندہ نہیں رہ سکتے۔ اللہ ہمیں تھوڑی سی سکھیا لا دو۔“

حسبِ عادت عالیہ بٹیا کہنے والی تھیں ”ابھی لو، یہ کون سی بڑی بات ہے!“ مگر پھر خود کشی کا خیال آیا تو لرز اٹھیں، کہنے لگیں ”تمہارے دشمن کھائیں سکھیا۔ میں سمجھاتی ہو خالہ جان کو۔“

مگر جب خالہ جان نے بھی ان سے سکھیا لانے کی فرمائش کی تو عالیہ بٹیا کے کلیجے پر آرے چلنے لگے۔ وہ جو کسی کے چہرے پر میل آتے دیکھ کر لرز اٹھیں۔ خود کشی کی دھمکیوں سے ادھ مری نہ ہو جائیں تو اور کیا کریں گی۔

دو تین دن تو ایسی ویران اور پراگندہ پھریں کہ ہم سب سمجھے چلو عالیہ بی کی مٹی عزیز ہو گئی۔ انھیں ضرور کسی نہایت بھیا تک آدمی سے عشق ہو گیا ہے۔

”اے بھئی لعنت ہے عشق پر یہاں پر کشتوں کے پستے لگنے والے ہو رہے ہیں اور تم لوگوں کو مذاق سو جھ رہا ہے، مرجائے گی کم بخت رضو.....، وہ روہانسی ہو گئیں۔“

”ارے تو شادی کر لے نادر سے۔ اس میں کیا ہے۔ وہ کوئی بچی تھوڑی ہے۔“

”تو خالہ جان مرجائیں گی۔“

”ارے ہٹاؤ کوئی نہیں مرتا۔ ارے اب تو لوگ ہیضہ طاعون کے مارے نہیں مرتے تو

بے چارے عشق کی کیا بساط ہے؟“

”کہنا کیا؟ بس بھگوا دو اسے نادر کے ساتھ۔“

مگر جب نہایت خوشی خوشی وہ رضو بٹیا کو بھگوانے پہنچیں تو وہ پسر گئیں اور خاندان کی ناک لے دوڑیں۔ لیکن عالیہ بٹیا کوئی معمولی وکیل نہیں تھیں۔ انھوں نے رضو کو چاروں شانے چت گرا دیا۔ ایسے کہ انھیں نادر کے ساتھ بھاگنے کے سوا اور ہر شے ناممکن نظر آنے لگی۔ آخر انھوں نے

دبی زبان سے اقرار کیا کہ بھاگ تو وہ بے شک جائیں مگر.....

اور ”مگر“ نے اتنا بڑا منہ پھاڑ کر عالیہ بٹیا کو عجیب شش و پنج میں ڈال دیا۔ بٹیا بھاگیں تو جائیداد سے قطعی ہاتھ دھونے پڑیں گے۔

”سو تو ہے،..... مگر نادر کے لیے تو تم ہر قربانی دینے کو تیار ہو“، انھوں نے کج بخشی شروع کر دی۔ یہی تو عالیہ بٹیا میں خرابی تھی کہ رات کو دن کہنا شروع کریں گی تو بس اڑیل ٹٹو کی طرح کہتی ہی چلی جائیں گی۔ اُن کا کیا ہے۔ وہ ماموں کے ٹکڑوں پر پلیں۔ انھوں نے وہ سکھ کہاں جھیلے جو بے چاری رضو بٹیا کی گھٹی میں پڑ چکے ہیں۔ کھری دری اور میلی تو شک پر سونے والی نرم نرم گدوں کی کم بخت عادت کو کیا جانے؟ سال میں چھ جوڑوں میں گزر کرنے والی کو کیا پتا کہ جب الماریاں کپڑوں سے اٹاٹ ہو جائیں تو لباس کے چناؤ میں کیسے کیسے پا پڑ سلینے پڑتے ہیں، علو بٹیا کا ایک چپل پھٹ جاتا ہے تو کہیں جا کے دوسرا پہن سکتی ہیں۔ مگر وہ غریب جس کے پاس پچاس جوڑی جوتے ہوں وہی انتخاب کی درد سہی کو سمجھ سکتی ہے۔

رضو بی کی مجبوریوں پر غور کر کے عالیہ کی آنکھیں چھلک اٹھیں اور خالہ جان کو راضی کرنے پر جھٹ گئیں کہ وہ ہنسی خوشی بیٹی کی شادی نادر سے کر کے اسے کوئی عمدہ سی نوکری دلوا دیں۔

مگر خالہ جان مُردار، ایک اڑیل، ٹس سے مس نہ ہوئیں۔

”تم اُوکا سمجھاؤ.....“

”کس کو؟“

”اُوکا، نادر کا سمجھاؤ کہ بٹیا کو پھانسنے کا خیال چھوڑ دے۔“

حد ہو گئی یعنی اتنی سیدھی بات اور علو بٹیا کو نہ سوجھی! سچ تو ہے نادر کو کیوں نہ سمجھایا

جائے۔ سمجھ دار آدمی ہے ضرور سمجھ جائے گا۔

ثابتی خاک چھانتی تیرے میرے وسیلے سے ملاقات کرنے پہنچیں۔ خالہ جان کی حالت زار

کا دردناک نقشہ کھینچا۔ مگر وہ ظالم نہ پسینا۔ یہی کہے گیا ”وہ جہالت کا زمانہ گیا جب والدین اولاد پر ظلم کیا کرتے تھے۔“

”یوں نہ کہیے“، عالیہ نے آنکھوں میں آنسو بھر کے کہا ”والدین اور ظلم!“ حالاں کہ انھیں والدین سے کبھی پالا نہ پڑا تھا۔ بچپن ہی میں انھیں دونوں لاوارث چھوڑ گئے تھے۔ ایک دھندلی سی یاد باقی تھی۔ لامتناہی پیارا اور شفقت کا ایک مٹا مٹا سا عکس دماغ کے کسی نرم و نازک حصہ پر اپنا داغ چھوڑ گیا تھا۔

”آپ کے والدین آپ پر سختی نہیں کرتے؟“

”والدین سختی کیسے کر سکتے ہیں؟ حالاں کہ میرے والدین جب میں ذرا سی تھی جب ہی انتقال کر گئے۔ ہاں بس یہی ایک ظلم انھوں نے مجھ پر کیا کہ مجھے اپنی سختیوں سے محروم کر دیا۔“

”اوہ..... مجھے بڑا افسوس ہے۔“

پھر بڑے جوش و خروش سے وہ رضیہ اور خالہ جان کی وکالت کرنے لگیں۔

”آپ رضیہ کی بہن ہیں؟“ نادر نے پوچھا۔

”بہن ہی سمجھ لیجیے“

”سمجھ لینے کی بھی اچھی کہی گویا آپ ہیں نہیں تو پھر آپ کا ان سے کیا رشتہ ہے؟“

”وہ میری کلاس میٹ ہے، بہن سے بھی بڑھ کر.....“

”اور ان کی اماں خالہ سے بھی بڑھ کر.....؟“

”جی۔“

”آپ کی کوئی سگی خالہ ہیں؟“

”جی نہیں..... مگر ہوتیں تو.....“

”او سمجھا.....“

”تو آپ کوشش کریں گے کہ“

”کہ رضیہ کو بھلا دوں؟“

”جی۔“

”ان کی احق والدہ کی خوشنودی کے لیے؟“

”جی ہاں دوسرے..... رضیہ ابھی کم سن ہے۔ اپنا برا بھلا نہیں سمجھتی۔“

”یہ آپ سے کس نے کہا؟“ نادر نے کٹتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”جی؟“ علو بیٹا بوکھلا گئیں۔ کم بخت کی کیسی گہری گہری آنکھیں تھیں، جیسے دو کنویں، کہ

آدمی ڈوبتا ہی چلا جائے۔ ہائے بے چاری رضو!

”خالہ جان نے؟“ اس نے جلدی سے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ علو بیٹا جلدی میں کہہ گئیں۔

”آپ کی کیا عمر ہوگی؟“ اُس نے وکیلوں جیسی جرح جاری رکھی۔

”جی؟..... مگر میری عمر سے اور رضیہ کی زندگی سے کیا واسطہ؟“

وہ بڑی مستعدی سے بولیں۔

”یوں ہی میں نے پوچھا۔“

”رضیہ مجھ سے بہت چھوٹی ہے.....“

”بہت چھوٹی ہے؟“

”ہاں یقیناً ہوگی۔“ عالیہ نے بڑے وقار سے کہا۔

”یہی کوئی دو ڈیڑھ سال.....؟“

”قطعاً.....“

”ہوں..... اچھا ایک بات بتائیے..... یہ آپ کی خالہ جان وہی نا، وہ..... وہ آپ کی

کفیل ہیں؟“

”نہیں مجھے اسکا لرشپ ملتا ہے۔ اوہ آپ غلط سمجھے ایسی کوئی بات نہیں میں اپنے ماموں

میاں کے ساتھ رہتی ہوں۔“

”وہ بھی آپ کی کسی کلاس فیلو کے باپ ہیں.....؟“

”نہیں وہ تو میرے سکے ماموں ہیں۔“

”تو پھر آپ جو رضیہ کو میرے چنگل سے چھڑانا چاہ رہی ہیں اس میں آپ کا کیا فائدہ

ہے؟“ نادر نے بدتمیزی سے پوچھا۔

”وہ میری بڑی پیاری دوست ہے۔“ عالیہ بٹیا اس قسم کے تحقیر آمیز جملوں کی عادی تھیں۔ ان کے ماتھے پر شکن بھی نہ پڑی۔

”اور آپ سمجھتی ہیں کہ میں اتنا خطرناک آدمی ہوں کہ رضیہ کو میرے چنگل سے چھڑانا ثواب کا کام ہے؟“ نادر کا چہرہ متمتا اٹھا۔

”جی نہیں یہ بات تو نہیں.....“

”میں خطرناک نہیں؟“

”نہیں..... تو بہ کیجیے..... آپ تو بڑے شریف آدمی ہیں مگر.....“

”جی شکریہ..... ہاں مگر.....“

”مگر یہ کہ آپ نکلے..... اوہ سوری.....“

”کہیے کہیے تکلف کی کیا بات ہے“ نادر نے دانت پیس کر کہا۔

”نہ کمائیں نہ دھمائیں، رضیہ کی جائیداد پر.....“ انھوں نے ہکلا کر سر جھکا لیا۔ کسی کو بھی سخت سست کہنے کی انھیں عادت نہ تھی۔

نادر کا پارہ چڑھ گیا۔ اس نے علو بٹیا کو کھری کھری سنا دیں کہ وہ خود چوں کہ اوروں کی خیرات پر پٹی ہیں، اس لیے انھیں سواروپے کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اپنی طرح دوسروں کو بھی سمجھتی ہیں۔ علو بٹیا نے بالکل برا نہیں مانا۔ واقعی وہ وظیفوں کے بل بوتے پر زندہ تھیں اور وظیفے بھی ایک طرح کی خیر خیرات ہی ہوتے ہیں۔

”ہوں تو میرا اور رضیہ کا کوئی جوڑ نہیں؟“ نادر پھنکارا۔

”جی نہیں..... وہ نازوں کی پالی، عیش و عشرت کی عادی ہے۔“ بڑی ڈھٹائی سے علو بٹیا ڈٹی رہیں۔

”اچھا میرا اور آپ کا تو جوڑ ہے۔“ نادر کہنے پن پر اتر آیا مگر بٹیا کچھ نہ سمجھیں۔ جھٹ بولیں ”جی ہاں کیوں کہ میں بقول آپ کے خیرات پر پٹی ہوں۔ میرے لیے تو ماموں جان کہتے ہیں

بس کوئی شریف آدمی۔“ ایک دم علو بٹیا چپ ہو گئیں کیوں کہ نادر نہایت بد ذاتی سے مسکرا رہا تھا۔
ہائے یہ کیا کہہ گئیں۔

”میں شریف آدمی ہوں؟“ اس نے آنکھیں ترچھی کر کے پوچھا۔

”جی.....“ علو بٹیا بری طرح بوکھلا کر بھاگ کھڑی ہوئیں۔

”پکا لوفر ہے۔ رضیہ کی جان چھوٹی تو اب میرے پیچھے لگ لیا۔“

انہوں نے ایک دم لاہریری میں دکھڑا رونا شروع کیا۔ رضیہ کی جدائی میں نادر پاگل ہو رہا تھا۔ اس نے انھیں دھمکی دی کہ تم نے میری کٹی کروائی ہے اب تمہیں سنبھالو۔ نہیں تو چلا میں گوشتی لیں۔ رضو بٹیا، منیر میاں کے پکچر پوسٹ کارڈ دیکھ دیکھ کر نادر کو بھول چلی تھی۔ اور اب نادر علو بٹیا کا

جانی دشمن ہو رہا ہے۔ ان کے گھر پر حملہ شروع کر دیا ہے۔ ماموں جان ممانی جان بجائے ڈانٹنے کے اور اس کی خاطر کرتے ہیں۔ علو نے بہت چاہا کہ اسے نادر بھائی جان کہے مگر اس نے واضح کر دیا کہ اگر لفظ بھائی نہ استعمال کریں تو زیادہ موزوں رہے گا۔ ویسے یہ قاضی لوگ تو سب بھائی وائی کی دو لفظوں میں ایسی تیزی کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اور منیر میاں ہیں کہ آنے کا نام نہیں لیتے۔ اگر یہ کچھ چیں چڑھتی ہیں تو نادر دھمکاتا ہے کہ پھر رضو کو ورغلا نے لگے گا۔ خیر سے بٹیا کا نکاح ہو جائے تو پھر مردود کو دھتا بتادی جائے گی۔ مگر وہ تو انتقام لینے پر تھلا ہوا ہے اور علو بٹیا کی مٹی پلید کر کے رہے گا۔ کیوں کہ اس نے ماموں میاں کو پیغام بھی دے دیا ہے۔ جب انہوں نے کہا لڑکی سے پوچھ کر جواب دیں گے تو نامراد بولا ”میں نے ان کا عندیہ لے لیا ہے۔“

”عندیہ کا بچہ!“ علو بٹیا دھاروں دھار روتی تھیں اور نادر کی جان کو کوسی تھیں۔

”بھئی یہ اچھی مصیبت ہے“ ہم لوگ بھی ان کے ساتھ مل کر کوستے۔ یوں ایک یتیم لڑکی

کی زندگی کے درپے ہونا کہاں کی انسانیت ہے، کھسیانی بلی کھبانو چے، رضیہ بی نے پتہ کاٹ دیا تو وہ اس بیچاری کا دشمن ہو گیا۔

دو دن علو بٹیا غائب رہیں۔ پھر جو کالج آئیں تو دیکھ کر کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ پٹی ہوئی

صورت، جیسے مہینوں کی بیمار جھلکی جھلکی ہوئی ہوئی آنکھیں سر پر دوپٹہ زور سے منڈھے۔ لڑکیوں نے عیادت کی غرض سے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ دوپٹہ سر کا تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے مانگ قوس قزح بنی ہوئی جگمگا رہی تھی، مٹھیاں کھولیں تو ارمانون کا خون حنا کا رنگ باندھ رہا تھا، اُف! اور علو بٹیا ایک ایک کے گلے لگ کر سسک رہی تھیں۔

”صبر کرو علو پیاری“ سب نے تسلی دی۔

”کیسے صبر کروں، میری بہن، اس نے تو مجھے کہیں منہ دکھانے کا نہ رکھا، ہائے خالہ جان میرے جنم میں تھوک رہی ہیں۔ اس شخص کی مکاری دیکھو، ماموں میاں تک کو نہ بتایا کہ ٹڈل ایسٹ میں کوئی ڈیڑھ ہزار کی نوکری لگ گئی ہے..... منیر میاں نے اٹلی میں کسی فرنگن سے شادی کر ڈالی۔ اب خالہ جان کوس رہی ہیں کہ میں نے ان کی رضو کے منگیتر کو ورغلا کر خود پھانس لیا۔“

علو بٹیا ہچکیوں سے روتی رہیں اور امتحان کے بعد ان کا جانی دشمن انھیں لے کر ٹڈل ایسٹ کی طرف اڑ گیا۔